زبان، تخلیقی زبان اور اسلوب

عطیہ خانم
ریسرچ اسکالر(شعبۂ اردو)
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی
Email:atiyakhan855@gmail.com

ملخص

زبان خیال کو نگینے کی طرح ادب کی انگشتری میں فٹ ہی نہیں کرتی بلکہ اسے چمکاتی دمکاتی بھی ہے اور ایسا مسالحہ لگاتی ہے کہ وقت گزر جاتا ہے مگر اس کی رونق ماند نہیں پڑتی۔ اس کا حسن باقی رہتا ہے۔ مہابھارت، رامائن، شاہنامۂ اسلام، الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، سب رس، کربل کتھا، نوطرزِ مرصع، باغ و بہار، آب حیات وغیرہ کی آب و تاب آج بھی اسی لیے موجود ہے کہ زبان نے اپنے کیمیائی عمل سے انھیں حسن بے مثال اور عمرِ لازوال بخش دیا ہے۔ زبان تخلیقیت کے اظہار کا محض ایک ذریعہ ہی نہیں بلکہ وہ تخلیقیت کے اظہار کا شاید سب سے اہم اور موثر وسیلہ ہے۔ اس لیے کہ زبان میں تخلیقیت بولتی ہی نہیں بلکہ سنائی بھی دیتی ہے اور کانوں میں موسیقی بھی گھولتی ہے۔ تخلیقیت جب زبان میں ڈھلتی ہے تو کہانی بن جاتی ہے، شاعری ہو جاتی ہے، ناول کا روپ لے لیتی ہے، ڈرامے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سفرنامہ، خاکہ، سوانح حیات وغیرہ بھی بن جاتی ہے۔ زبان اور تخلیقی زبان کے ساتھ ایک اور لفظ بھی اکثر آ جاتا ہے اور وہ ہے بیان یا اسلوب، اس لفظ کی ماہیت بھی اچھی طرح سامنے آ جانی چاہیے تاکہ جب ہم زبان و بیان کی بات کریں یا کسی خاص فرد کے اسلوب یا کسی دور کے اسلوب یا کسی رجحان یا تحریک کے اسلوب کا ذکر کریں تو اس کی واضح تصویر ہمارے سامنے آ سکے۔

زبان، تخلیقی زبان اور اسلوب

ہر ایک فنِ لطیف کے اظہار کا کوئی نہ کوئی مخصوص وسیلہ ہوتا ہے۔ مثلاً فنِ موسیقی کے اظہار کا ذریعہ سر تال ہیں تو مصوری کا رنگ اور رقص کے ہاؤ بھاؤ۔ اسی طرح ادب کا وسیلہ زبان ہے۔

ادب کی تخلیق میں زبان کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے، زبان ہی وہ وسیلہ ہے جس کی بدولت انسانی محسوسات و جذبات اور خیالات و تجربات ایک سینے سے نکل کر دوسرے سینے تک جا پاتے ہیں۔ اگر زبان نہ ہوتی تو انسانی فکر و احساس اتنی آسانی سے ہم تک نہیں پہنچتے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ افکار و تجربات اور محسوسات و مشاہدات کو محفوظ کیا ہے بلکہ حواس کو محظوظ بھی کرایا ہے، ایک طرح سے دیکھا جائے تو ادب کی معنویت اور اس کی کامیابی کا انحصار زبان پر ہوتا ہے۔ زبان فن پارے کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ فن کار اور فن کار کے عہد کو بھی سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے ادب پارے کو سمجھنے اور اس کے زمان و مکان کو جاننے کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پہلے زبان اور ادب کے رشتے کو سمجھا جائے۔ زبان کی اس جادو گری کو پہچانا جائے جس کے عمل سے ادبی اظہار عام اظہار سے مختلف، معنی خیز، سحر انگیز اور پر اثر ہو جاتا ہے۔ کوئی ایک لفظ کیسے کسی پوری عبارت کو پر لطف بنا دیتا ہے اور کیسے کوئی ایک لفظ پوری عبارت کے حسن کو غارت کر دیتا ہے؟ کیسے شبنم کی جگہ ''اوس لانے سے شعر کی شعریت غائب ہو جاتی ہے اور کس طرح کسی لفظ کی جگہ کسی دوسرے لفظ کے آ جانے سے شعر کی معنویت دو بالا ہو جاتی ہے؟ زبان خیال کو لفظوں کے ساتھ اس طرح مربوط کرتی ہے کہ اختلاطِ لفظ و معنی ارتباطِ جان و تن بن جاتا ہے۔ اسی لیے آتش نے اسے مرصع سازی کا نام دیا تھا۔

شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

زبان خیال کو نگینے کی طرح ادب کی انگشتری میں فٹ ہی نہیں کرتی بلکہ اسے چمکاتی دمکاتی بھی ہے اور ایسا مسالحہ لگاتی ہے کہ وقت گزر جاتا ہے مگر اس کی رونق ماند نہیں پڑتی۔ اس کی چکا چوندھ بنی رہتی ہے۔ اس کا حسن باقی رہتا ہے۔ مہابھارت، رامائن، شاہنامۂ اسلام، الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، سب رس،

کربل کتھا، نوطرزِ مرصع، باغ و بہار، آب حیات وغیرہ کی آب و تاب آج بھی اسی لیے موجود ہے کہ زبان نے اپنے کیمیائی عمل سے انھیں حسن بے مثال اور عمرِ لازوال بخش دیا ہے۔

زبان وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول اور حالات سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ تغیر زبان کی فطرت ہے۔ اس میں ٹوٹ پھوٹ بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس کا بگاڑ اس کے بناؤ کا سبب بھی بنتا ہے اور یہ بگاڑ اس کی راہیں روکتا نہیں بلکہ اس کی رفتار کو رواں اور تیز گام کرتا ہے۔

بدلتی ہوئی زبان ادب کو بھی متاثر کرتی ہے۔ وہ ادب پاروں میں تبدیلی لاتی ہے، تخلیق کو نیا رنگ و آہنگ دیتی ہے۔ نئی معنویت بخشتی ہے، نیا رخ عطا کرتی ہے، نئی ڈگر پہ لے جاتی ہے، نئی منزلوں سے ہم کنار کرتی ہے۔

بدلی ہوئی زبان فن پارے کو بہتر بھی بنا سکتی ہے اور اسے بگاڑ بھی سکتی ہے۔ ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ زبان سے ادب بہتر بھی ہوا ہے اور اس کا رنگ روپ بگڑا بھی ہے۔ ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی اور دکن کے بعض دوسرے شعراء و ادبا نے فارسی زبان میں دکنی اور ہندوستانی زبانوں کی آمیزش کر کے اردو کو نیا مزاج بخش دیا۔ ایسا مزاج جس میں اس طرح کے اشعار کے لیے گنجائش پیدا ہوگئی ۔

نہیں کوئی دھرم دھاری جو کہے پیتم سوں سمجھا کر
کہ دکھیا کوں بجو ہی سوں اتا بیزار کرنا کیا

— — — —

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادوں ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

— — — —

اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں
تو پاؤں کے جھانجھے کی جھنکار سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

ان شعروں میں دھرم دھاری، پیتم، دکھیا، بجو ہی، سوں اتا، نین، اندھاری، تس سوں، ٹک،

جھانجھے، لٹ، دھرم یہ الفاظ اردو فارسی عربی سے نہیں بلکہ ہندوستانی زبانوں سے داخل ہوئے ہیں۔ اردو میں ہندوستانی زبانوں کے یہ اور اس طرح کے دیگر الفاظ شامل نہیں ہوتے تو اردو زبان کا دامن اتنا وسیع نہیں ہوتا جتنا کہ آج ہے اور وہ ہیرے اردو کے دامن میں نہیں جگمگاتے جو دوسرے دریاؤں سے نکال کر اردو کے دامن میں بھر دیے گئے ہیں مگر تاریخ میں اس بات کی بھی مثال موجود ہے کہ دوسری زبانوں کے دخول سے اردو شاعری کا اپنا مزاج بگڑا بھی۔ اس کی شناخت میں دھبّا بھی پڑا، اس کا وقار مجروح بھی ہوا، ایہام گوئی اس کی واضح مثال ہے۔ اس ایہام گوئی کے چکر میں شاعری کے اندر سے شعریت غائب ہوئی اور ایسے ایسے الفاظ داخل ہوگئے جن کے سبب نہ صرف یہ کہ زبان کی شائستگی مجروح ہوئی، روانی رکی بلکہ اہل زبان کو شرمندگی بھی اٹھانی پڑی اور جس سے بچنے اور ایہام گوئی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے مظہر جان جاناں اور ان کے کچھ ہم عصر شعرا کو اصلاحی تحریک چلانی پڑی۔

اس بحث سے ایک نکتہ یہ برآمد ہوا کہ ہر عہد میں ادب کی زبان تبدیل ہوتی رہی ہے۔ یہ بدلاؤ کسی عہد میں زیادہ ہوا ہے اور کسی عہد میں کم۔ زبان کی یہ تبدیلی بعض زمانوں میں ادب کی پہچان بھی بنتی رہی ہے۔ زبان میں ہونے والے تغیرات اردو زبان کے ادب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں دیکھا بھی گیا۔ حالاں کہ اردو والے اپنی زبان کے تئیں بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔ آسانی سے وہ تبدیلی کو قبول نہیں کرتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کی زبان کا خالص پن باقی رہے۔ دوسری زبانوں کے میل جول سے بگڑے نہیں۔ وہی الفاظ اس میں شامل ہوں جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ ان کی یہ کوشش تاریخ کے مختلف موڑ پر دکھائی دیتی ہے اور بعض اوقات تو ان کی یہ کوشش تحریک کی شکل بھی اختیار کرتی ہوئی نظر آئی مگر زمانہ اپنی چال چلتا جاتا ہے اور اس کی چال کامیاب ہوتی رہتی ہے۔ اگر زمانے کی چال رُک جائے تو دوسری چیزوں کے ہمراہ زبان و بیان کی رفتار بھی دھیمی پڑ جائے اور یہ دھیما پن اس کی راہ کا روڑا بن جائے۔ اس لیے کہ زمانہ اپنے ساتھ بہت کچھ لاتا ہے۔ اس بہت کچھ میں بہت کچھ نیا بھی ہوتا ہے جو پرانے سانچوں میں فٹ نہیں بیٹھتا، وہ اپنے لیے نیا سانچا تیار کرتا ہے۔ زمانے کا یہ عمل زبان و ادب میں بھی دکھائی دیتا رہتا ہے۔ اسی لیے جدوجہد اور تحریکیں چلانے کے باوجود ہم نئے سانچوں کو بننے سے روک نہیں پاتے۔ اس لیے کہ ہمارے نئے محسوسات و تجربات پرانے سانچوں میں داخل نہیں ہو پاتے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ زمانے کی یہ نئی رفتار کبھی تیز ہوتی ہے اور کبھی ست

روایتی سست گامی کی وجہ سے صاف صاف دکھائی نہیں دیتی مگر تیز گامی اور باریک بیں نظروں میں آجاتی ہے اس لیے کہ یہ رفتار اپنے اردگرد جھکڑ اٹھاتی ہوئی چلتی ہے اور چوں کہ اس پر وقت کی ہوا کا دباؤ بہت تیز ہوتا ہے اس لیے گردباد صاف صاف دور اور دیر تک دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ زمانے کی تیز رفتاریاں اردو زبان و ادب میں 1857 کے عہدِ غدر، 1936ء کے دورِ ترقی پسند، 1950 دور جدیدیت اور 1980 کے بعد والے مابعد جدیدیت کے دور میں بھی میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ جن لوگوں کی نظر میں تاریخ کے یہ ادوار موجود ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان ادوار میں کیا، کہاں اور کس کس سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس طرح کی تبدیلیاں شاعری اور فکشن دونوں میں ہوئی ہیں۔ البتہ زبان کی سطح پر یہ شاعری میں کم اور فکشن میں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شاعری میں کم اس لیے کہ شعر و سخن میں کچھ عروضی بندشیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے آپ میں بہت مضبوط اور قدامت پسند ہوتی ہیں بلکہ روایت پسند کہنا چاہئے، اس لیے انھیں توڑنا یا ان میں توڑ پھوڑ کرنا آسان نہیں ہوتا مگر فکشن میں ایسی بندشیں نہیں ہوتیں اور اس کی زبان روایت پسند بھی نہیں ہوتی اس لیے زمانہ اپنی چال ادھر آسانی سے چل دیتا ہے۔ زمانے کی اس چال کے نشانات 1980 کے افسانوی ادب میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ نشانات کس طرح کے ہیں، ان کے کیا رنگ روپ ہیں یہ دیکھنے سے پہلے یہ جان لینا مناسب ہوگا کہ زبان اور تخلیقی زبان میں کیا فرق ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ادب کی تخلیق میں زبان کس طرح کا کردار نبھاتی ہے؟

زبان اور تخلیقی زبان:

تخلیقی زبان کے رنگ و آہنگ پر نظر ڈالنے سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تخلیقیت ہوتی کیا ہے؟ یعنی تخلیقیت کیا ہے اور اس کا کام کیا ہے؟ یعنی تخلیقی عمل کا پروسس کیا ہے؟

تخلیقیت انسان کو ودیعت کی گئی قوتوں میں سے ایک ایسی قوت ہے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیتی ہے۔ تخلیقیت یعنی قوتِ تخلیق ایسی قوت ہے جو نئی چیزوں کے وجود میں آنے کی محرک بنتی ہے اور جو نئی چیزیں تو پیدا کرتی ہی ہے پرانی اشیا کو بھی نیا بنا کر پیش کرتی ہے، سپاٹ پن میں انوکھا پن لاتی ہے۔ سادگی میں پرکاری پیدا کرتی ہے اور ایسی تخلیق سامنے لاتی ہے جس میں احساس رقص کرتا ہے، جذبہ جوش مارتا ہے، تخیل اڑان بھرتا ہے اور لفظ اپنا جادو دکھاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقیت وہ قوت ہے جو ٹھہرے ہوئے پانی میں موجیں پیدا کرتی ہے اور ترنگیں اُٹھاتی ہے۔ پانی پر طرح

طرح کی شکلکیں بناتی ہےاور شکلوں میں رنگ برنگ کے منظر دکھاتی ہے۔ یہ قوتِ احساس کو گرماتی ہے ، جذبے کو بیدار کرتی ہے، تخیل کو پرواز بخشتی ہے اور لفظ کو رنگ، خوشبو اور موسیقی میں تبدیل کرتی ہے۔

تخلیقیت جن دوسری قوتوں پر انحصار کرتی ہے ان میں سب سے اہم قوت قوتِ متخیلہ ہے ۔ دراصل یہ قوت تخلیقی عمل کو انجام دیتی ہے۔ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ یا مطالعہ کے ذریعے دماغ میں پہلے سے موجود ہوتا ہے یہ اس کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں ڈھالتی ہے جو معمولی پیراؤں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے عالمِ کائنات ایک اور عالم بن جاتا ہے۔ یعنی یہ قوت تجربات کو نئے سرے سے تشکیل ہی نہیں کرتی بلکہ نئی حقیقت بھی خلق کرتی ہے۔

تخلیقیت اور ذہانت میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ جو شخص جتنا ذہین ہوگا نت نئے انداز سے سوچنے اور کام انجام دینے کی صلاحیت اتنا ہی زیادہ ہوگی۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انوکھے پن کی اسی صلاحیت کے ڈانڈے تخلیقیت سے ملتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں بھی تخلیقیت کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تخلیقیت کی ہی شکل ہے کہ سر کے بال سے لے کر پیر کے جوتے تک نئے نئے انداز میں سامنے آتے رہے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے۔

یہ جوہر فطرت کی جانب سے ہر بشر کو بخشا گیا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنی اس قوت کو پہچانے، اس جوہر کو چمکائے اور اس کی چمک دمک سے حیات و کائنات کی راہوں کو روشن کرے۔

تخلیقیت مختلف صورتوں میں متحرک رہتی ہے یعنی وہ مختلف روپ میں اپنا کردار نبھاتی ہے۔ اس کے اسی تحریک یا کردارانہ حرکت کا نام تخلیقی عمل ہے۔

تخلیقی عمل:

وہ عمل جس سے گزر کر کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے تخلیقی عمل کہلاتا ہے۔ ہر لکھنے والے کا تخلیقی عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی تخلیق کار اپنی مختلف تحریروں میں الگ الگ عمل سے گزرتا ہے۔ یعنی تخلیقی عمل طے شدہ نہیں ہوتا، کبھی تو بغیر کسی منصوبہ بندی کے کوئی تخلیق وجود میں آجاتی ہے اور کبھی خیال کو پیش کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بنایا جاتا ہے۔

اردو میں تخلیقی عمل اوراس کے اظہار کو دو اصطلاحوں کے حوالے سے جانا اور پہچانا گیا ہے۔
' آمد' وہ تخلیقی عمل ہے جو فطری انداز میں کسی فن پارے کو جنم دیتا ہے۔اس میں فن پارے کو کسی قسم کی کوئی کوشش یا محنت نہیں کرنی پڑتی۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شے اپنے آپ لفظوں میں ڈھل گئی ہو اور ' آورد' وہ تخلیقی عمل ہے جو فطری نہ ہو کر تقلیدی ہوتا ہے جس میں لکھنے والے کے ارادے کا دخل ہوتا ہے۔یعنی وہ باقاعدہ کسی منصوبہ کے تحت کد و کاش کے ذریعے کسی فن پارے کو معرض وجود میں لاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ کسی کوشش اور ارادے کے عمل سے پیش کی گئی تخلیقات جذبے اور احساس کی شدت سے عاری ہوتی ہیں۔اس میں تخلیقی حسن کی بھی کمی ہوتی ہے لیکن تخلیق کاروں کے تجربات اوران کے بیانات بتاتے ہیں کہ تخلیقی عمل آمد اور آورد کے دائرے سے باہر ہوتا ہے۔بعض فن پارے ایسے بھی ہیں جن کے پیدا ہونے میں آمد اور آورد دونوں کا امتزاج رہا ہے۔یعنی فطری اظہار کے ساتھ ساتھ اس میں منصوبہ بندی کا بھی ہاتھ رہا ہے۔خاص طور سے ناول لکھنے میں منصوبہ بندی کا خاصاً عمل دخل رہتا ہے۔

تخلیقی عمل ایک پراسرار اور پیچیدہ عمل ہوتا ہے۔اسے پورے طور پر لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔الگ الگ لوگوں کا تخلیقی عمل الگ الگ ہوتا ہے۔کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیق کار جس بات کو بنیادی موضوع یا نکتہ سمجھتا ہے۔قاری اس کے بجائے کسی اور نکتے کو اس کا موضوع قرار دیتا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لکھتے وقت لکھنے والے کے ذہن میں جو دوسرے تجربات موجود ہوتے ہیں وہ بھی تخلیقی عمل میں اِدھر اُدھر سے شریک ہو جاتے ہیں اوران میں کوئی نکتہ جو مصنف کے خیال میں تو بنیادی حیثیت نہیں رکھتا مگر قاری کے ذہن میں زیادہ نمایاں ہو کر آ جاتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مصنف بعد میں قاری کی رائے سے اتفاق بھی کر لیتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل واقعی ایک پیچیدہ اور پراسرار عمل ہے۔

تخلیقیت اور زبان:

انسان اپنی سیمابی جبلّت کے سبب ہر لمحے اور ہر قدم پر ایسا کچھ کرنا چاہتا ہے جس سے اس کے آس پاس کی صورتِ حال بدل جائے۔کچھ نیا پیدا ہو جائے۔پرانا نیا ہو جائے۔ماحول میں تازگی کا احساس ہو۔دل و دماغ کو لطف و انبساط ملتا رہے۔اپنی اور دوسروں کی زندگیوں میں بھی رنگ اور رس بھرتا رہے۔انسان کی یہی خواہش،اس کے اندرون کی یہی رو اور اس کا اظہار اس کی تخلیقیت ہے۔

انسان کی اسی تخلیقیت کے اظہار کے لیے ادب وفنون پیدا ہوتے ہیں مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ صرف ادب اور فنون کو تخلیق کرنا ہی تخلیقیت ہے بلکہ تخلیقیت کی دوسری صورتیں بھی موجود ہیں۔ زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے، فطرت اور کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے، معاشرے میں امن وامان برقرار رکھنے اور انسانوں کے ذہنی وقلبی اطمینان اور ان کے کیف ونشاط میں اضافہ کرنے والے چھوٹے چھوٹے کام بھی تخلیقیت کے مظہر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسی اداس آدمی کو ہنسا دینا، کسی کے بوجھ کو ہلکا کر دینا، کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو راہ دکھا دینا، کسی لاچار اور بے بس کی مدد کر دینا، کسی مسئلہ کو سلجھا دینا یا سلجھانے میں ہاتھ بٹا دینا یہ سارے کام بھی تخلیقی رو کے تحت ہی ہوتے ہیں۔ تخلیقی رو کے زیر اثر ہی اظہار کے نت نئے وسیلے اور بیان کے مختلف النوع طریقے وجود میں آئے۔ زبان بھی اسی کے زیرِ اثر پیدا ہوئی اور ادب وفن کے اظہار کا وسیلہ بنی۔

تخلیقیت کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں ایک زبان بھی ہے بلکہ زبان تخلیقیت کے اظہار کا شاید سب سے اہم اور مؤثر وسیلہ ہے۔ اس لیے کہ زبان میں تخلیقیت بولتی ہی نہیں بلکہ سنائی بھی دیتی ہے اور کانوں میں موسیقی بھی گھولتی ہے۔ یعنی لفظ کسی خیال یا بات کو صرف بیان ہی نہیں کرتے بلکہ فنِ موسیقی کی طرح اس میں جھنکار بھی پیدا کرتے ہیں اور مصوری کی مانند نقش ونگار بھی بناتے ہیں۔

یعنی تخلیقیت جب زبان میں ڈھلتی ہے تو کہانی بن جاتی ہے، شاعری ہو جاتی ہے، ناول کا روپ لے لیتی ہے، ڈرامے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سفرنامہ، خاکہ، سوانح حیات وغیرہ بھی بن جاتی ہے۔ زبان فکر وخیال کے اظہار میں جادو بھر دیتی ہے، اس کی معنویت کو وسعت وگہرائی عطا کر دیتی ہے اور اس طرح ایک معمولی نکتہ بھی زبان میں ڈھل کر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

ایک بات یہاں قابلِ ذکر یہ ہے کہ وہ زبان جو تخلیقیت کے اظہار کا وسیلہ بنتی ہے وہ عام زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ یعنی تخلیقی زبان اور عام زبان میں فرق ہوتا ہے۔ عام زبان میں صرف معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں جبکہ تخلیقی زبان میں معلومات کے ساتھ ساتھ لطف وانبساط بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جسے سن کر تم چونک پڑو گے تو یہ ایک عام زبان کی مثال ہوگی اور اسی بات کو جب منٹو اپنی کہانی 'نیا قانون' میں یہ کہتا ہے:

''لا ہاتھ ادھر'' ایسی خبر سناؤں کہ تیرا جی خوش ہو جائے، تیری اس گنجی کھونپڑی پر بال اُگ آئیں۔''

تو یہ تخلیقی زبان کی مثال بن جائے گی۔ یا اسی طرح منٹو کی اسی کہانی کا یہ اقتباس:

''صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے''

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی۔ گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہو۔ اس کا چہرہ نہیں رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس گورے کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔''

بھی تخلیقی زبان کا ایک عمدہ نمونہ بن گیا ہے۔ یہ عبارت تخلیقی زبان اس لیے بن گئی ہے کہ اس میں زبان کے ان وسیلوں سے کام لیا گیا ہے جن سے عام زبان تخلیقی اوصاف سے متصف اور مزیّن ہو جاتی ہے۔ اگر یہ حربے استعمال نہ ہوں تو زبان میں تخلیقیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

زبان میں تخلیقیت یوں نہیں ظاہر ہوتی بلکہ اس کے لیے خاص طور سے دو قوتیں: قوتِ متخیّلہ اور قوتِ ممیّزہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ قوتِ ممیّزہ لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں مدد کرتی ہے اور قوتِ متخیّلہ اس میں تشبیہ، استعارہ، پیکر، علامت اور دوسری شعری صنعتوں کی مدد سے رنگ بھرتی ہے۔ اسی انتخاب اور ترتیب کی بدولت موزونیت پیدا ہوتی ہے جس سے موسیقی پھوٹتی ہے اور اسی سے محاکات بھی پیدا ہوتی ہے جس سے کوئی خیال یا جذبہ تصویر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ مثلاً

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اس شعر میں لفظوں کے انتخاب اور ان کی مخصوص ترتیب سے ہی موسیقی کی سی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ اسی طرح میرؔ کے اس شعر ۔

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ

میں اس انتخاب اور ترتیب سے تصویر اُبھاری گئی ہے یا پریم چند کی کہانی 'کفن' کی اس

عبارت:

''آلو کھا کر دونوں پانی نے پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے، جیسے دو بڑے اژر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

کرشن چندر کی کہانی کالو بھنگی کے اس پیراگراف:

''کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لیے اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے، اپنے پھٹے پھٹے کھردے بد ہیئت پاؤں لیے اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری دریدیں لیے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لیے، اپنے بھوکے پیٹ اور خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لیے، اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گردآلود بالوں کی جھاڑیاں لیے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔''

بلراج مینرا کی کہانی کمپوزیشن کے اس اقتباس:

''سیاہ کمرے میں، سیاہ روشنی میں، سیاہ لباس میں، سیاہ کرسی میں دھنسا ہوا سیاہ میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی جو سیاہ قلم سے سیاہ کاغذ پر سیاہ عبارت لکھتا ہے۔ میری مشکل بن گیا ہے......وہ آدمی جس کی کل کائنات ایک کمرہ جہاں دنیا بھر کی سیاہی سمٹ گئی ہے، کمرے کے باہر اور کمرے کے اندر سیاہی ہے۔ جہاں رات گئے تک وہ تکتا رہتا ہے۔ سیاہی بھی خاموش ہے۔''

اور غضنفر کے افسانہ 'کڑوا تیل' کے ان جملوں:

''بیل اوپر سے نیچے اور آگے سے پیچھے تک پٹا ہوا تھا۔ پٹھا پچک گیا تھا۔ پیٹ دونوں طرف سے دھنس گیا تھا۔ پیٹھ بیٹھ گئی تھی۔ گوشت سوکھ گیا تھا۔ ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ قد بھنچا ہوا تھا۔ گردن سے لے کر پٹھے تک پورا جسم چابک کے نشان سے اَٹا پڑا تھا۔ جگہ جگہ کھال اُدھڑ گئی تھی۔ دونوں سینگوں کی نوکیں ٹوٹی ہوئی

تھیں۔ کانوں کے اندر اور باہر جلدخور کیڑے جلد سے چمٹے ہوئے تھے۔ پچھلا حصہ پیروں تک گوبر میں سنا ہوا تھا۔ دُم بھی میل میں لپٹی پڑی تھی۔ دُم کے بال بیل کے چھیرے سے لت پت ہو کر لٹ بن گئے تھے۔ پچھلے ایک پاؤں سے خون بھی رس رہا تھا۔"

میں محاکات یعنی مختلف پیکر ابھرتے ہیں۔

تخلیقیت زبان کے وسیلے سے جن صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے ان میں شعری اور نثری دوصورتیں اہم ہیں اور ان شعری اور نثری صورتوں کی بھی کئی کئی شکلیں ہیں۔ مثلاً شعری شکلوں میں غزل، نظم،مثنوی، مرثیہ،قصیدہ، رباعی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں اور نثری صورتوں میں داستان، افسانہ، ناول، ڈرامہ، خاکہ،سفرنامہ وغیرہ اہم ہیں۔

تخلیقی زبان کے الفاظ اکثر اپنے ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتے جن معنوں میں انھیں لغات میں درج کیا گیا ہے۔ وہ اپنے لغوی معنی سے الگ بھی معنی دیتے ہیں اور اپنے لغوی معنی میں اضافہ بھی کر دیتے ہیں اور ان کے رخ کو بھی بعض اوقات بدل دیتے ہیں اور کبھی کبھی تو معنی کے برعکس معنی کے اظہار کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ تخلیقی زبان میں لفظ اپنی تہیں کھولنے لگتے ہیں اور ان تہوں سے معانی کے نئے نئے شیڈس نکلنے لگتے ہیں۔

اسلوب:

زبان اور تخلیقی زبان کے ساتھ ایک اور لفظ بھی اکثر آجاتا ہے اور وہ ہے بیان یا اسلوب، اس لفظ کی ماہیت بھی اچھی طرح سامنے آجانی چاہیے تاکہ جب ہم زبان و بیان کی بات کریں یا کسی خاص فرد کے اسلوب یا کسی دور کے اسلوب یا کسی رجحان یا تحریک کے اسلوب کا ذکر کریں تو اس کی واضح تصویر ہمارے سامنے آسکے۔

اسلوب پر ماہرین لسانیات، اسلوبیات اور ادبیات سبھی نے اپنے اپنے ڈھنگ سے نکتہ آفرینیاں کی ہیں اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اسلوب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کی سعی کی ہے مگر ظاہر ہے کہ فنون لطیفہ کی کسی صنف یا اس کے کسی عنصر کی کوئی بھی تعریف جامع و مانع نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ناقدین اور علمائے ادب کے بیانات میں اختلاف کی گنجائش بنی رہتی ہے مگر کچھ باتیں جو سب میں مشترک

نظر آتی ہیں ان کی بنیاد پر اگر ہم اسلوب کی تعریف کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب، طرز بیان یا اندازِ بیان کو کہتے ہیں، کسی بات کو کہنے کا طریقہ یا ڈھنگ اسلوب کہلاتا ہے، ایک بات کوئی طریقے یا کئی ڈھنگ سے کہا جا سکتا ہے، اس سے اسلوب کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً سورج ڈوبتے ہی ہر طرف اندھیرا چھا گیا یا آفتاب غروب ہوتے ہی ہر سو تاریکی پھیل گئی۔ ان دونوں جملوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ان دونوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ کہنے کا طریقہ یا انداز الگ الگ ہے۔ بس یہی دونوں جملوں میں اسلوب کا فرق ہے۔ پہلے جملے کا اسلوب غیر رسمی اور بے تکلفانہ ہے اور دوسرے جملے کا اسلوب پر تکلف اور رسمی یعنی formal ہے۔ اسلوب زبان کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنی کتاب 'اسلوبیاتی تنقید' میں اسلوب کی بڑی آسان اور منطقی تعریف کی ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلوب، جسے انگریزی میں اسٹائل (Style) کہتے ہیں، اس سے عام طور پر کسی کام کو کرنے کا ڈھنگ، طریقہ یا انداز مراد لیا جاتا ہے۔ ہر شخص کے کام کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے، نیز ہر شخص اپنے اپنے طور یا ڈھنگ سے کسی کام کو سرانجام دیتا ہے۔ اسی کو اس شخص کا اسٹائل یا اسلوب کہتے ہیں مثال کے طور پر اگر کسی شخص سے کسی ایک موضوع کی تقریر کرنے کے لیے کہا جائے تو اس کی تقریر کرنے کا انداز اسی موضوع پر دوسرے شخص کی تقریر کے انداز سے مختلف ہوگا، یعنی لفظوں کا انتخاب، جملوں کی ترتیب اور ادائیگی، آوازوں کا اتار چڑھاؤ اور زور، نیز چہرے کے نقوش اور اعضا کی حرکت، یہ تمام باتیں اس شخص کی اپنی ہوں گی جن سے اس کے تقریر کرنے کے انداز، ڈھنگ یا اسٹائل کا پتا چلے گا۔ گفتگو کے علاوہ چال ڈھال، رہن سہن اور لباس کی وضع قطع سے بھی کسی شخص کے اسٹائل کا پتا چلتا ہے۔ اسلوب بھی اسی کا نام ہے لیکن یہ اسلوب کا عام مفہوم ہے اور اس کی نہایت سادہ و سہل تعریف ہے۔''

ادب میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر مصنف کے یہاں ایک اسلوب پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے یہاں زبان کا استعمال ملتا ہے۔ اسی طرح ہر فن کا بھی اپنا اسلوب ہوتا ہے اور ہر عہد کا بھی اپنا ایک جداگانہ اسلوب ہوتا ہے۔ بقول مرزا خلیل احمد بیگ:

''اسلوب الگ سے مسلط کردہ کوئی چیز نہیں بلکہ یہ مصنف کی زبان میں جاری و ساری اور پیوست ہوتا ہے۔ یہ اسلوبیاتی نقاد کا کام ہے کہ وہ مصنف کے یہاں زبان کے استعمال کے امتیازات کا پتا لگائے اور اس کے اسلوبی خصائص (Style feather) کو نشان زد کرے۔''

چوں کہ اسلوب زبان کا ایک اہم حصہ ہے، اسی لیے اس پر ادیبوں اور لسانیات کے ماہروں نے اپنے اپنے طور پر تفصیل سے لکھا ہے جس کی وجہ سے اسلوب کو سمجھنے میں کنفیوزن بھی پیدا ہوتا رہا ہے جیسے مشہور مفکر والٹر پیٹر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:

''Style is a certain absolute and unique manner of expressing a thing in all its intensity and colour.

یعنی اسلوب کسی خیال یا معنی کے طریقِ اظہار کا نام ہے۔

مشہور فرانسیسی ادیب Buffon کہتا ہے کہ Style is the man یعنی اسلوب ہی انسان ہے۔ ایمرسن Buffon کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسان کا ہر اسلوب اس کی ذہنی آواز ہے۔ نیومن کا خیال ہے: Style is the affluence of character and not merely and external decoreation" یعنی اسلوب صرف ادیب کی داخلی شخصیت اور طرز مشاہدہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے طرز احساس کا نام ہے۔

اس طرح مڈلٹسن مرے کے مطابق اسلوب نہ صرف ادیب بلکہ اس کی پوری تہذیب کے نقوش کا نام ہے۔ مڈلٹسن مرے کی اس تعریف کا منشا یہ ہے کہ اسلوب دراصل اظہار کی وہ ذاتی انفرادیت ہے جس سے مصنف کی ذات کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کی بھی جھلک ملتی ہے۔

لوکاس جو انگریزی ادب کا ایک معروف و ممتاز نقاد ہے، اسلوب کے متعلق یہ فرماتا ہے کہ فن کار کی شخصیت اتنی اہم ہے کہ اگر وہ غیر ادبی باتیں بھی کرتا ہے تو وہ بھی اپنے قاری کو جمالیاتی حظ پہنچا سکتا ہے اور اسے متاثر کرسکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا اندازِ بیان، اس کا اسلوب اتنا متاثر کن ہو کہ قاری کے دل میں اتر جائے۔

پروفیسر علی رفاد فتیحی لکھتے ہیں:

''اسلوب دراصل ادیب یا شاعر کا وہ مخصوص فنکارانہ طریقہ کار ہے جس کی مدد سے وہ اپنے خیالات واحساسات کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

مذکورہ بالا بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہرین اسلوبیات ولسانیات اور علمائے ادب وفن کے نزدیک اسلوب کا تصور یکساں نہیں ہے سبھی اپنے اپنے طور پر اسلوب کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر مبتدیوں کے لیے ان کے بتائے گئے خط وخال رہنمائی کرنے کے بجائے اور الجھا دیتے ہیں۔ البتہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ بیان اس الجھن اور کنفیوزن کو دور کرنے میں بہت حد تک معاون ثابت ہوتا ہے:

''پس اسلوب کے قدیم اور جدید تصور یعنی اسلوبیات کے تصور میں پہلا بڑا فرق یہی ہے کہ اسلوبیات کی رو سے اسلوب کی حیثیت ادبی اظہار میں اضافی نہیں، بلکہ اصلی ہے۔ یعنی اسلوب لازم ہے یا ادبی اظہار کا ناگزیر حصہ ہے یا اس تخلیقی عمل کا ناگزیر حصہ ہے جس کے ذریعے زبان ادبی اظہار کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یعنی ادبی اسلوب سے مراد لسانی سجاوٹ یا زینت کی چیز نہیں جس کا رَد یا اختیار میکانکی ہو، بلکہ اسلوب فی نفسہٖ ادبی اظہار کے وجود میں پیوست ہے۔''

اسلوب پر یہ تفصیلی گفتگو اس لیے کی گئی کہ اسلوب کا رشتہ زبان سے بہت گہرا ہے اور بقول سوئفٹ مناسب جگہ پر مناسب لفظ کا استعمال ہی اسلوب کی کامیابی ہے۔ سوئفٹ اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے "In proper place proper word" سوئفٹ کی اس تعریف میں زبان وبیان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ دراصل اسلوب الفاظ اور تجربے کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مناسب الفاظ کے انتخاب سے تخلیق کار لفظ اور تجربے اس آپسی رشتے کو مربوط ومستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایک کنفیوزن اب بھی باقی رہتا ہے کہ کچھ لوگ اسلوب اور تکنیک میں امتیاز نہیں کر پاتے، تکنیک کو بھی اسلوب سمجھ لیتے ہیں اور اسلوب کو ہی تکنیک کہنے لگتے ہیں۔

☆☆☆